تقریر

تقریر بابت مسیح موعودؑ
وقت 5-7 منٹ

حضرت مسیح موعودؑ کی احباب جماعت کو نصائح

(ملفوظات جلد 4 ایڈیشن 1984ء)

(تقریر نمبر 4)

اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرماتا ہے۔

مَنۡ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجۡعَلۡ لَّہٗ مَخۡرَجًا (الطلاق:3)

جو اللہ سے ڈرے اُس کے لئے وہ نجات کی کوئی راہ بنا دیتا ہے۔

اِسلام چیز کیا ہے؟ خدا کے لئے فنا
ترکِ رضائے خویش پَے مرضی خدا
جو مر گئے انہی کے نصیبوں میں ہے حیات
اِس رہ میں زندگی نہیں ملتی بجز ممات

معزز سامعین! حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے اپنی زندگی میں بے شمار تقاریر کیں، درس دیئے، مجالسِ عرفان سے خطاب فرمایا۔ آپؑ کے اِن ملفوظات، ارشادات، مناجات کو 10 جلدوں میں منضبط کیا۔ اِن میں ہزاروں کی تعداد میں احبابِ جماعت کو قیمتی نصائح سے نوازا۔ ”مشاہدات“ کے تحت احبابِ جماعت کے لئے اکٹھا کیا جارہا ہے اور جلد 4 سے نصائح پیش کی رہی ہیں۔ یہ جلد چہارم کی تقریر نمبر 4 ہے۔

اسلامی جہاد کا فلسفہ کیا ہے؟

حضورؑ نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”مذہبی امور میں آزادی ہونی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَاۤ اِکۡرَاہَ فِی الدِّیۡنِ (البقرۃ:257) کہ دین میں کسی قسم کی زبردستی نہیں ہے۔ اس قسم کا فقرہ انجیل میں کہیں بھی نہیں ہے۔ لڑائیوں کی اصل جڑ کیا تھی۔ اس کے سمجھنے میں اُن لوگوں کو غلطی ہوئی ہے۔ اگر لڑائی کا ہی حکم تھا تو 13 برس رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے تو پھر ضائع ہی گئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آتے ہی تلوار نہ اٹھائی۔ صرف لڑنے والوں کے ساتھ لڑائیوں کا حکم ہے۔ اسلام کا یہ اصول کبھی نہیں ہوا کہ خود ابتدا جنگ کریں۔ لڑائی کا سبب کیا تھا اُسے خود خدا نے بتلایا ہے کہ ظُلِمُوۡا۔ خدا تعالیٰ نے جب دیکھا کہ یہ لوگ مظلوم ہیں تو اب اجازت دیتا ہے کہ تم بھی لڑو۔ یہ نہیں حکم دیا کہ اب وقت تلوار کا ہے تم زبردستی تلوار کے ذریعہ لوگوں کو مسلمان کرو بلکہ یہ کہا کہ تم مظلوم ہو اب مقابلہ کرلو۔ مظلوم کو تو ہر ایک قانون اجازت دیتا ہے کہ حفظ جان کے واسطے مقابلہ کریں۔ ایسے خیالات کی اشاعت کا الزام پادریوں پر نہیں ہے بلکہ اُسے خود ملاؤں نے اپنے اوپر پختہ کیا ہے۔ خدا تعالیٰ کا ہرگز یہ منشا نہیں ہے کہ ایک غافل شخص جسے دین کی حقیقت معلوم نہیں ہے اُسے جبراً مسلمان کیا جائے۔ اب ایک بنیا جس کی عمر ساٹھ پینسٹھ سال کی ہے اسے دین کی خبر ہی نہیں تو اس کے گلے پر تلوار رکھ کر اُس سے لا الہ الا اللہ کہلانے سے کیا حاصل ہوگا۔ خدا تعالیٰ کا منشا ہے کہ غفلت چونکہ بہت ہوگئی ہے اب دلائل سے سمجھا دیوے۔ اگر جہاد کریں بھی تو کس سے کریں؟ سب سے اوّل تو انہیں مسلمانوں سے کرنا چاہیے کہ جنہوں نے دین کو تباہ کر دیا ہے۔ صحابہ کرامؓ تو خدا کے فرشتے تھے اور جب ناعاقبت اندیش لوگوں نے تلواریں اٹھائیں تو خدا نے انہیں اُن کے ذریعہ اُن کو سزائیں دلوائیں مگر آج کل کے یہ لوگ جن کی مثال ڈاکوؤں کی ہے کیا یہ خدا تعالیٰ کے وکیل ہوسکتے ہیں۔ قرآن سے تو ثابت ہوتا ہے کہ کافر سے پہلے فاسق کو سزا دینی چاہیے۔ خدا تعالیٰ نے اسی لیے چنگیز خان کو اُن پر مسلط کر دیا تھا تاکہ مماثلت پوری ہو۔ جیسے یہودیوں پر بخت نصر کو متعین کر دیا تھا ایسے

ہی ان پر چنگیز خان کو۔ اُس کے وقت میں ایک بزرگ تھے اُن کے پاس لوگ گئے کہ وہ دعا کریں۔ اُنہوں نے جواب دیا کہ تمہاری حرام کاریوں کی وجہ سے ہی تو چنگیز خان مسلّط ہوا ہے۔ قتل کے بعد سنا ہے کہ چنگیز خان نے اسلام کے علماء فضلا کو بلا کر پوچھا کہ اسلام کیا ہے؟ اُنہوں نے کہا کہ پنج وقتہ نماز ہے۔ کہنے لگا کہ یہ تو عمدہ بات ہے کہ اپنے کاروبار میں پانچ وقت دن میں خدا کو یاد کرنا۔ پھر اُنہوں نے زکوٰۃ بتلائی۔ اس کی بھی تعریف کی۔ تیسرے اُنہوں نے حج بتلایا اس کی اُسے سمجھ نہ آئی اس کے بیٹے کا اسلام کی طرف رجوع تھا مگر آخر پوتا بالکل مسلمان ہو گیا۔ اسی طرح بخت نصر یہودیوں پر مسلّط ہوا تھا مگر خدا تعالیٰ نے اسے کہیں ملعون نہیں کہا ہے بلکہ عِبَادًا لَّنَا ہی کہا ہے۔ یہ خدا تعالیٰ کا دستور ہے کہ جب ایک قوم فاسق فاجر ہوتی ہے تو اس پر ایک اور قوم مسلّط کر دیتا ہے۔“

(ملفوظات جلد 4 صفحہ 366-367)

نماز کیا ہے؟

فرمایا:

”نماز کیا چیز ہے؟۔ نماز اصل میں ربّ العزت سے دعا ہے جس کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا اور نہ عافیت اور خوشی کا سامان مل سکتا ہے۔ جب خدا تعالیٰ اس پر اپنا فضل کرے گا اس وقت اُسے حقیقی سرور اور راحت ملے گی۔ اُس وقت سے اُس کو نمازوں میں لذت اور ذوق آنے لگے گا جس طرح لذیذ غذاؤں کے کھانے سے مزہ آتا ہے اسی طرح پھر یہ گریہ و بقا کی لذت آئے گی اور یہ حالت جو نماز کی ہے پیدا ہو جائے گی۔ اس سے پہلے جیسے کڑوی دوا کو کھاتا ہے تا کہ صحت حاصل ہو اسی طرح اس بے ذوقی نماز کو پڑھنا اور دعائیں مانگنا ضروری ہیں۔ اس بے ذوقی کی حالت میں یہ فرض کر کے کہ اس سے لذت اور ذوق پیدا ہو یہ دعا کرے

کہ اے اللہ! تو مجھے دیکھتا ہے کہ مَیں کیسا اندھا اور نابینا ہوں اور مَیں اس وقت بالکل مردہ حالت میں ہوں۔ مَیں جانتا ہوں کہ تھوڑی دیر کے بعد مجھے آواز آئے گی تو مَیں تیری طرف آ جاؤں گا اس وقت مجھے کوئی روک نہ سکے گا۔ لیکن میرا دل اندھا اور ناشناسا ہے تو ایسا شعلہ نُور اس پر نازل کر کہ تیرا اُنس اور شوق اس میں پیدا ہو جائے۔ تُو ایسا فضل کر کہ مَیں نابینا نہ اٹھوں اور اندھوں میں نہ جا ملوں۔

جب اس قسم کی دعا مانگے گا اور اس پر دوام اختیار کرے گا تو وہ دیکھے گا کہ ایک وقت اس پر ایسا آئے گا کہ اس بے ذوقی کی نماز میں ایک چیز آسمان سے اس پر گرے گی جو رقّت پیدا کر دے گی۔“

(ملفوظات جلد 4 صفحہ 321-322)

نماز میں لذّت کیسے آئے

حضرت اقدس علیہ السلام نے فرمایا کہ

”نماز نماز بھی ہو۔ نماز سے بیشتر ایمان شرط ہے۔ ایک ہندو اگر نماز پڑھے گا تو اُسے کیا فائدہ ہو گا۔ جس کا ایمان قوی ہو گا وہ دیکھے گا کہ نماز میں کیسے لذت ہے اور اس سے یا اول معرفت ہے جو خدا تعالیٰ کے فضل سے آتی ہے اور کچھ اس کی طینت سے آتی ہے جو محمود فطرت والے مناسب حال اس کے فضل ہوتے ہیں اور اس کے اہل ہوتے ہیں انہی پر فضل بھی کرتا ہے۔ ہاں یہ بھی لازم ہے کہ جیسے دنیا کی راہ میں کوشش کرتا ہے ویسے ہی خدا کی راہ میں بھی کرے۔ پنجابی میں ایک مثل ہے جو منگے سو مر رہے مرے سو منگن جا۔ لوگ کہتے ہیں کہ دعا کرو۔ دعا کرنا مرنا ہوتا ہے۔ اِس پنجابی مصرع کے یہی معنی ہیں کہ جس پر نہایت درجہ کا اضطراب ہوتا ہے وہ دعا کرتا ہے۔ دعا میں ایک موت ہے اور اِس کا بڑا اثر یہی ہوتا ہے کہ انسان ایک طرح سے مر جاتا ہے۔ مثلاً ایک انسان ایک قطرہ پانی کا پی کر اگر دعوٰی کرے کہ میری پیاس بجھ گئی ہے یا یہ کہ اُسے بڑی پیاس تھی تو وہ جھوٹا ہے۔ ہاں اگر پیالہ بھر کر پیوے تو اِس بات کی تصدیق ہو گی۔ پوری سوزش اور گدازش کے ساتھ جب دعا کی جاتی ہے حتّٰی کہ روح گداز ہو کر آستانۂ الٰہی پر گر جاتی ہے اور اِسی کا نام دعا ہے اور الٰہی سُنّت یہی ہے کہ جب ایسی دعا ہوتی ہے تو خداوند تعالیٰ یا تو اُسے قبول کرتا ہے اور یا اُسے جواب دیتا ہے۔“

(ملفوظات جلد 4 صفحہ 339-340)

سامعین! تقویٰ اور استقامت اختیار کرو

شیخ فضل حق صاحب نو مسلم پشاور سے آئے ہوئے تھے ان کی موجودہ حالت پر فرمایا کہ

”آوائل میں جو سچا مسلمان ہوتا ہے اُسے صبر کرنا پڑتا ہے۔ صحابہ پر بھی ایسے زمانے آئے ہیں کہ پتّے کھا کھا کر گزارہ کیا۔ بعض وقت روٹی کا ٹکڑا بھی میسر نہیں آتا تھا کوئی انسان کسی کے ساتھ بھلائی نہیں کر سکتا جب تک خدا بھلائی نہ کرے جب انسان تقویٰ اختیار کرتا ہے تو خدا اس کے واسطے دروازہ کھول دیتا ہے مَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ

لَهٗ مَخۡرَجًا (الطلاق: 3)۔ خدا تعالیٰ پر سچا ایمان لاؤ اس سے سب کچھ حاصل ہو گا۔ استقامت چاہیے۔ انبیاء کو جس قدر درجات ملے ہیں استقامت سے ملے ہیں۔ اور یوں خشک نمازوں اور روزوں سے کیا ہو سکتا ہے؟"

(ملفوظات جلد 4 صفحہ 204)

نیکی کی جڑ اور تنعّم میں حدِّ اعتدال کے حوالے سے نصیحت

فرمایا:

"نیکی کی جڑ یہ بھی ہے کہ دنیا کی لذّات اور شہوات جو کہ جائز ہیں ان کو بھی حدِّ اعتدال سے زیادہ نہ لے جیسا کہ کھانا پینا اللہ تعالیٰ نے حرام تو نہیں کیا مگر اب اِسی کھانے پینے کو ایک شخص نے رات دن کا شغل بنالیا ہے۔ اس کا نام دین پر بڑھتا ہے ورنہ یہ لذّات دنیا کی اس واسطے ہیں کہ اس کے ذریعہ نفس کا گھوڑا جو کہ دنیا کی راہ میں ہے وہ کمزور نہ ہو۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے یکہ والے جب لمبا سفر کرتے ہیں تو سات یا آٹھ کوس کے بعد وہ گھوڑے کی کمزوری کو محسوس کر کے اسے دم دلا دیتے ہیں اور نہاری وغیرہ کھلاتے ہیں۔ تا کہ اس کی پچھلی تکان دُور ہو جاوے تو انبیاء نے جو حظ دنیا کا لیا ہے وہ اسی طرح ہے کیونکہ ایک بڑا کام دنیا کی اصلاح کا ان کے سپرد تھا۔ اگر خدا کا فضل ان کی دستگیری نہ کرتا تو ہلاک ہو جاتے۔ اس واسطے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی وقت حضرت عائشہؓ کے زانو پر ہاتھ مار کر فرماتے کہ اے عائشہ! راحت پہنچا۔ مگر انبیاء کا یہ دستور نہ تھا کہ اس میں ہی منہمک ہو جاتے۔ انہماک بے شک ایک زہر ہے ایک بد قماش آدمی جو چاہتا ہے کرتا ہے اور جو چاہتا ہے کھاتا ہے۔ اسی طرح اگر ایک صالح بھی کرے تو خدا کی راہیں اس پر نہیں کھلتیں۔ جو خدا کے لئے قدم اُٹھاتا ہے خدا کو ضرور اُس کا پاس ہوتا ہے۔ خدا تعالیٰ فرماتا ہے اِعۡدِلُوۡا ھُوَ اَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰی (المائدۃ: 9) تنعّم اور کھانے پینے میں بھی اعتدال کرنے کا نام ہی تقویٰ ہے۔ صرف یہی گناہ نہیں ہے کہ انسان زنا نہ کرے۔ چوری نہ کرے بلکہ جائز امور میں بھی حدِّ اعتدال سے نہ بڑھے۔"

(ملفوظات جلد 4 صفحہ 374-375)

اُسوہ حسنہ

فرمایا:

"ایک دفعہ حضرت عمرؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ آپ اندر ایک حُجرہ میں تھے۔ حضرت عمرؓ نے اجازت چاہی۔ آپؐ نے اجازت دی۔ حضرت عمرؓ نے آکر دیکھا کہ صف کھجور کے پتّوں کی آپؐ نے بچھائی ہوئی ہے اور اس پر لیٹنے سے پیٹھ پر پتّوں کے داغ لگے ہیں۔ گھر کی جائداد کی طرف حضرت عمرؓ نے نظر کی تو دیکھا کہ ایک گوشہ میں تلوار لٹکی ہوئی ہے۔ یہ دیکھ کر ان کے آنسو جاری ہو گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ اے عمر! تو کیوں رویا؟ عرض کی کہ خیال آتا ہے کہ قیصر و کسریٰ جو کافر ہیں۔ ان کے لئے کس قدر تنعّم اور آپ کے لئے کچھ بھی نہیں۔ فرمایا۔ میرے لئے دنیا کا اسی قدر حصہ کافی ہے کہ جس سے مَیں حرکت کر سکوں۔ میری مثال یہ ہے جیسے ایک مسافر سخت گرمی کے دنوں میں اُونٹ پر جا رہا ہو اور جب سورج کی تپش سے وہ بہت تنگ آوے تو ایک درخت کو دیکھ کر اس کے نیچے ذرا آرام کر لیوے اور جو نہی کہ ذرا پسینہ خشک ہو پھر اُٹھ کر چل پڑے۔ تو یہ اسوۂ حسنہ ہے جو کہ اسلام کو دیا گیا ہے۔ دنیا کو اختیار کرنا بھی گناہ ہے اور مومن کی زندگی اضطراب کے ساتھ گزرتی ہے۔

پھر ہماری دو آنکھیں ہیں اور کیا کچھ دیکھ رہی ہیں اور کوئی فولاد وغیرہ کی بنی ہوئی نہیں ہیں۔ ذرا بینائی جاتی رہے تو پھر ہستی کا اندازہ ہو جاتا ہے اور جب اندھا ہو تو موت ہی ہے۔ تو دنیا کی زندگی کا بھی یہی حساب ہے۔"

(ملفوظات جلد 4 صفحہ 375-376)

مومن کو آئندہ زندگی پر توجہ دینی ہو گی

فرمایا:

"مومن کو اس زندگی پر ہر گز مطمئن نہ ہونا چاہیے۔ اتنی بلائیں اس زندگی میں ہیں کہ شمار نہیں۔ ایک بیماری ہوتی ہے کہ انسان کا پاخانہ کا راستہ بند ہو جاتا ہے اور منہ کے راستہ پاخانہ آتا ہے اور اس کا نام ایلادس ہے پھر اسی طرح گردہ اور مثانہ کی بیماریاں ہیں کہ رنگارنگ کے سرخ، سبز اور سیاہ پتھر بن جاتے ہیں اور اُن کا کوئی خاص سبب بھی کیا بیان ہو سکتا ہے بلکہ امراء لوگ جو کہ عمدہ غذا اور نفیس پانی استعمال کرتے ہیں انہی کو ایسے امراض ہوتے ہیں۔ اگر دو شخص ایک ہی جگہ رہتے ہوں۔ ایک ہی قسم کی ان

کی خورونوش ہو۔ پھر ایک ان میں سے ایسے عوارضات میں مبتلا ہو جاتا ہے دوسرا نہیں ہوتا۔ اسی لئے طب کی متعلق کہتے ہیں کہ یہ ظنّی علم ہے۔ علل مادیہ میں یہ لوگ اسباب کی تحقیق کرتے ہیں مگر اس کا بھی سبب بتلادیں کہ جب الہام ہونے لگتا ہے یا کشف تو اس وقت نیند سی آنے لگتی ہے۔ اس کے کیا اسباب ہیں۔ ان لوگوں کا دستور ہے کہ جب ان کو ایک بات کا سبب معلوم نہ ہو تو اس سے انکار کر بیٹھتے ہیں اور اسی لئے وحی اور الہام کے منکر ہیں۔

یہ علُوم بے انتہا ہیں۔ جب تک بے اعتدالیوں کا حصہ دُور نہ کرے اس سے واقف نہیں ہو سکتے۔

أَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهِ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى (النّٰزعٰت:41) جو خواہش جائز اپنے مقامِ اعتدال سے بڑھ جاوے۔ اس کا نام ھوٰی ہے۔ "

(ملفوظات جلد 4 صفحہ 376-377)

تین بنیادی مراجع۔ قرآن، سُنّت اور حدیث کا مقام

فرمایا:

" ہمارے نزدیک تین چیزیں ہیں۔ ایک کتاب اور دوسرے سُنّت یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل اور تیسرے حدیث۔ ہمارے مخالفوں نے دھوکہ کھایا ہے کہ سنّت اور حدیث کو باہم ملایا ہے۔ ہمارا مذہب حدیث کے متعلق یہی ہے کہ جب تک وہ قرآن اور سُنّت کے صریح مخالف اور معارض نہ ہو اس کو چھوڑنا نہیں چاہئے خواہ وہ محدثین کے نزدیک ضعیف سے ضعیف کیوں نہ ہو۔ جبکہ ہم اپنی زبان میں دعائیں کر لیتے ہیں تو کیوں حدیث میں آئی ہوئی دعائیں نہ کریں۔ جبکہ وہ قرآن شریف کے مخالف بھی نہیں۔ قرآن شریف پر حدیث کا قاضی بنانا سخت غلطی ہے اور قرآن شریف کی بے ادبی ہے۔ حضرت عمرؓ کے سامنے ایک بڑھیا نے حدیث پیش کی تو انہوں نے یہی کہا کہ مَیں ایک بڑھیا کے لئے قرآن شریف نہیں چھوڑ سکتا۔ ایسا ہی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے سامنے کسی نے کہا کہ حدیث میں آیا ہے۔ ماتم کرنے سے مردہ کو تکلیف ہوتی ہے تو انہوں نے یہی کہا کہ قرآن میں تو آیا ہے۔ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی۔ پس قرآن پر حدیث کو قاضی ...بنانے میں اہل حدیث نے سخت غلطی کھائی۔ اصل بات یہ ہے کہ اپنی موٹی عقل کی وجہ سے اگر کوئی چیز قرآن میں نہ ملے تو اس کو سُنّت میں دیکھو اور پھر تعجب کی بات یہ ہے کہ جن باتوں میں ان لوگوں نے قرآن کی مخالفت کی ہے خود ان میں اختلاف ہے۔ ان کی افراط تفریط نے ہم کو سیدھی اور اصل راہ دکھادی۔ جیسے یہودیوں اور عیسائیوں کی افراط اور تفریط نے اسلام بھیج دیا۔ پس حق بات یہی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سنّت کے ذریعہ تواتر دکھادیا ہے اور حدیث ایک تاریخ ہے اس کو عزّت دینی چاہئے۔ سُنّت کا آئینہ حدیث ہے۔ یقین پر ظنّ کبھی قاضی نہیں ہوتا کیونکہ ظنّ میں احتمال کذب کا ہے۔ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک قابل قدر ہے۔ اُنہوں نے قرآن کو مقدم رکھا ہے۔ "

(ملفوظات جلد 4 صفحہ 116-117)

نیز فرمایا:

" پس اوّل قرآن کو مقدم کیا جاوے۔ اس کے بعد سُنّت۔ سُنّت یہ ہے کہ قرآن شریف میں جو احکام آئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو دکھلا دیا۔ جیسے نماز پڑھ کر بتادی کہ صبح کی یوں ہوتی ہے۔ شام کی یُوں۔ جیسے جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن شریف سے استنباط کئے۔ ویسے ویسے آپؐ بتلاتے رہے اور جو آپؐ کے اقوال تھے ان کا نام حدیث ہے۔ ایک سُنّت یہ بھی تھی کہ آپؐ فوت ہو گئے۔ قرآن شریف میں ہے۔ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ یعنی سب رسول فوت ہو گئے۔ آپؐ بھی فوت ہوں گے۔ چنانچہ خدا کی بات پُوری ہو گئی اور آپؐ فوت ہو گئے۔ "

(ملفوظات جلد 4 صفحہ 151-152)

اسلام فطرتی مذہب ہے

فرمایا:

" اس کے معنے یہی ہیں کہ اسلام فطرتی مذہب ہے۔ انسان کی بناوٹ جس مذہب کو چاہتی ہے وہ اِسلام ہے۔ اس کے یہ معنے ہیں کہ اسلام میں بناوٹ نہیں ہے۔ اس کے تمام اصول فطرتِ انسانی کے موافق ہیں۔ تثلیث اور کفارہ کی طرح نہیں ہیں۔ جو سمجھ میں نہیں آسکتے۔ عیسائیوں نے خود مانا ہے کہ جہاں تثلیث نہیں گئی وہاں توحید کا مطالبہ ہو گا۔ کیونکہ فطرت کے موافق توحید ہی ہے۔ اگر قرآن شریف نہ بھی ہوتا۔ تب بھی انسانی فطرت توحید ہی کو مانتی۔ کیونکہ وہ باطنی شریعت کے موافق ہے۔ ایسا ہی اسلام کی کُل تعلیم باطنی شریعت کے موافق ہے۔ برخلاف عیسائیوں کی تعلیم کے جو مخالف ہے۔ دیکھو! حال ہی میں امریکہ میں طلاق کا قانون خلافِ انجیل پاس کرنا پڑا۔ یہ دقّت کیوں پیش آئی۔ اس لئے کہ انجیل کی تعلیم فطرت کے موافق نہ تھی۔ "

(ملفوظات جلد 4 صفحہ 122)

سامعین! عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ کے حوالے سے نصیحت

حضورؑ فرماتے ہیں:

" آیت (اَنَّ الْاَرْضَ یَرِثُھَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ) سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ الْاَرْضَ سے مراد جوشام کی سرزمین ہے۔ یہ صالحین کا ورثہ ہے اور جو اَب تک مسلمانوں کے قبضہ میں ہے۔ خدا تعالیٰ نے یَرِثُھَا فرمایا۔ یَمْلِکُھَا نہیں فرمایا۔ اس سے صاف پایا جاتا ہے کہ وارث اس کے مسلمان ہی رہیں گے جیسے راہن اپنی چیز کا قبضہ مرتہن کو دے دیتا ہے۔ یہ خدا تعالیٰ کی پیشگوئی کی عظمت ہے۔ ارضِ شام چونکہ انبیاء کی سرزمین ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ اس کی بے حرمتی نہیں کرنا چاہتا کہ وہ غیروں کی میراث ہو۔ یَرِثُھَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ فرمایا۔ صالحین کے معنے یہ ہیں کہ کم از کم صلاحیت کی بنیاد پر قدم ہو۔ مومن کی جو تقسیم قرآن شریف میں کی گئی ہے۔ اس کے تین ہی درجے اللہ تعالیٰ نے رکھے ہیں۔ ظالم، مقتصد، سابق بالخیرات۔ یہ ان کے مدارج ہیں۔ ورنہ اسلام کے اندر یہ داخل ہیں۔ ظالم وہ ہوتا ہے کہ ابھی اس میں بہت غلطیاں اور کمزوریاں ہیں اور مقتصد وہ ہوتا ہے کہ نفس اور شیطان سے اس کی جنگ ہوتی ہے۔ مگر کبھی یہ غالب آجاتا ہے اور کبھی مغلوب ہوتا ہے۔ کچھ غلطیاں بھی ہوتی ہیں اور صلاحیت بھی اور سابق بالخیرات وہ ہوتا ہے جو اِن دونوں درجوں سے نِکل کر مستقل طور پر نیکیاں کرنے میں سبقت لے جاوے اور بالکل صلاحیت ہی ہو۔ نفس اور شیطان کو مغلوب کر چکا ہو۔ قرآن شریف ان سب کو مسلمان ہی کہتا ہے۔

ہماری جماعت ہی کو دیکھ لو کہ وہ ایک لاکھ سے زیادہ ہے اور یہ سب کی سب ہمارے مخالفوں ہی سے نِکل کر بنی ہے اور ہر روز جو بیعت کرتے ہیں یہ اُن میں ہی سے آتے ہیں ان میں صلاحیت اور سعادت نہ ہوتی تو یہ کِس طرح نِکل کو آتے۔ بہت سے خطوط اس قِسم کی بیعت کرنے والوں کے آتے ہیں کہ پہلے مَیں گالیاں دیا کرتا تھا۔ مگر اب توبہ کرتا ہوں مجھے معاف کیا جاوے۔ غرض صلاحیت کی بنیاد پر قدم ہو تو وہ صالحین میں داخل سمجھا جاتا ہے۔"

(ملفوظات جلد 4 صفحہ 125-126)

حضرت محمدؐ کے صحابہؓ اور حضرت موسیٰؑ و حضرت عیسیٰؑ کے حوایوں کی قربانیوں میں فرق

فرمایا:

"صحابہ، رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسے وفادار اور مطیع فرمان تھے کہ کسی نبی کے شاگردوں میں ایسی نظیر نہیں ملتی اور خدا کے احکام پر ایسے قائم تھے کہ قرآن شریف ان کی تعریفوں سے بھرا پڑا ہے۔ لکھا ہے کہ جب شراب کی حُرمت کا حکم نافذ ہوا تو جس قدر شراب برتنوں میں تھی وہ گرا دی گئی اور کہتے ہیں اس قدر شراب بہی کہ نالیاں بہ نکلیں اور پھر کسی سے ایسا فعلِ شنیع سرزد نہ ہوا اور وہ شراب کے پکّے دشمن ہوگئے۔ دیکھو! یہ کیسا ثبات اور استقلال علی الطاعت تھا۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت جس وفاداری، محبت اور ارادت اور جوش سے انہوں نے کی۔ کبھی کسی نے نہیں کی۔ موسیٰ علیہ السلام کی جماعت کے حالات پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ کئی بار پتھراؤ کرنا چاہتی تھی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواری تو ایسے کمزور اور ضعیف الاعتقاد تھے کہ خود عیسائیوں کو تسلیم کرنا پڑا ہے اور حضرت مسیح آپ انجیل میں سُست اعتقاد اُن کا نام رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنے اُستاد کے ساتھ سخت غداری کی اور بے وفائی کا نمونہ دکھایا کہ اس مصیبت کی گھڑی میں الگ ہوگئے۔ ایک نے گرفتار کرا دیا۔ دوسرے نے لعنت بھیج کر انکار کر دیا۔

مگر صحابہؓ ایسے ارادتمند اور جان نثار تھے کہ خود خدا تعالیٰ نے ان کی شہادت دی کہ انہوں نے خدا تعالیٰ کی راہ میں جانوں تک دینے میں دریغ نہیں کیا اور ہر صفت ایمان کی اُن میں پائی جاتی ہے۔ عابد، زاہد، سخی، بہادر اور وفادار، یہ شرائط ایمان کی کسی دوسری قوم میں نہیں پائی جاتیں۔

جس قدر مصائب اور تکالیف صحابہؓ کو ابتدائے اسلام میں اُٹھانی پڑیں۔ اُن کی نظیر بھی کسی اور قوم میں نہیں ملتی۔ اس بہادر قوم نے ان مصیبتوں کو برداشت کرنا گوارا کیا۔ لیکن اسلام کو نہیں چھوڑا۔ ان مصیبتوں کی انتہا آخر اس پر ہوئی کہ ان کو وطن چھوڑنا پڑا اور نبی کریمؐ کے ساتھ ہجرت کرنی پڑی اور جب خدا تعالیٰ کی نظر میں کفّار کی شرارتیں حد سے تجاوز کر گئیں اور وہ قابل سزا ٹھہر گئیں تو خدا تعالیٰ نے اُنہیں صحابہؓ کو مامور کیا کہ اس سرکش قوم کو سزا دیں۔ چنانچہ اس قوم کو جو مسجدوں میں دن رات اپنے خدا کی عبادت کرتی تھی اور جس کی تعداد بہت تھوڑی تھی۔ جس کے پاس کوئی سامان جنگ نہ تھا۔ مخالفوں کے حملوں کے روکنے کے واسطے میدانِ جنگ میں آنا پڑا۔ اسلامی جنگیں دفاعی تھیں۔

پھر ان جنگوں میں یہ چند سو کی جماعت کئی کئی ہزار کے مقابلہ میں آئی اور ایسی بہادری اور وفاداری سے لڑی۔ اگر حواریوں کو اس قسم کا موقع پیش آتا تو اُن میں سے ایک بھی آگے نہ ہوتا۔ ایک ذرا سے ابتلا پر وہ اپنے آقا کو چھوڑ کر الگ ہوگئے تو ایسے معرکوں میں ان کا ٹھہرنا ایک ناممکن بات ہے۔ مگر اس ایمان دار اور وفادار قوم نے اپنی

شجاعت اور وفاداری کا پُورا نمونہ دکھایا اور جو کچھ جوہر انہوں نے دکھائے وہ سچے ایمان اور یقین کے نتائج تھے۔ موسیٰ علیہ السلام نے جب اپنی قوم کو کہا کہ بڑھ کر دشمن پر حملہ کرو۔ تو انہوں نے کیا شرمناک جواب دیا۔ فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ تُو اور تیرا رب جاؤ اور لڑو ہم تو یہیں بیٹھے رہیں گے۔ صحابہؓ کی لائف میں ایسا کوئی موقع نہیں آیا۔ بلکہ انہوں نے کہا کہ ہم اُن میں سے نہیں ہیں جنہوں نے یہ کہا کہ فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ ایسی قوت اور شجاعت اور وفاداری کا جوش کیونکر پیدا ہو گیا تھا؟ یہ سب ایمان اور یقین کا نتیجہ تھا جو آپؐ کی قوتِ قدسی اور تاثر کا اثر تھا۔ آپؐ نے اُن کو ایمان سے بھر دیا تھا۔"

(ملفوظات جلد 4 صفحہ 137-139)

اللہ تعالیٰ اِن پر ہم سب کو عمل کرنے کی توفیق دے۔ آمین

(کمپوزڈ: منہاس محمود و مسز بقعۃُ النور عمران۔ جرمنی)

✡✡✡✡